بحث و نظر

جسٹس شوکت علی اور شریعتِ اسلامی

(ادارہ)

جسٹس شوکت علی (ریٹائرڈ جج) نے جنگ کے نمائندے کو انٹرویو دیتے ہوئے اسلامی قانونِ شہادت پر بھی اظہار خیال فرمایا۔ شائع شدہ انٹرویو سے اقتباس:-

سوال:- آپ بحیثیت سابق جج ہائی کورٹ اور سینیئر وکیل، قانونِ شہادت اور ضابطہ فوجداری میں کوئی ترمیم تجویز کرتے ہیں۔

جواب:- (از جسٹس شوکت علی صاحب) میں اپنے تجربے کی روشنی میں کہوں گا کہ قانونِ شہادت اور ضابطۂ فوجداری میں کوئی ترمیم یا تبدیلی کرنے سے عوام کی مشکلات میں مزید اضافہ ہوگا اور کسی کو انصاف نہیں ملے گا۔ میں اپنی بات ایک مثال دے کر واضح کرتا ہوں کہ ایک شخص کو عین اُس وقت قتل کر دیا جاتا ہے جب گھر میں اس کی بیوی کے سوا کوئی اور فرد موجود نہیں ہے۔ باوجود اس کے کہ مقتول کی بیوہ قاتل کو پہچانتی ہے، اسلامی قانون میں گواہی نہیں دے سکے گی کیونکہ اسلام میں اُس کی گواہی آدھی ہے۔ اس طرح ملزم بچ نکلے گا۔ اسی طرح اسلامی قانون کے مطابق جب کوئی مسلمان کسی غیر مسلم کو قتل کرے گا تو اُسے سزا نہیں دی جا سکے گی۔ آپ ہی بتائیے اس طرح اقلیتوں کا مستقبل کیا ہوگا۔ اس لیے میرے خیال میں تعزیراتِ پاکستان کو جوں کا توں رہنے دیا جائے، البتہ اسلامی آئین کے حوالے سے لکیر کا فقیر بننے کے بجائے اس کی سپرٹ لے لی جائے۔

ججوں کی کلاس کے متعلق مجھے ہمیشہ بہت حسنِ ظن رہا ہے کہ یہ لوگ بڑے تدبّر پسند ہوتے ہیں اور

منظم طریقِ فکر کے عادی، اس وجہ سے بات کریں تو بڑی ذمہ داری سے کرتے ہیں اور اختلاف کریں تو محکم دلائل کی بنا پر متوازن طریق سے کرتے ہیں۔ لیکن اُوپر کے اقتباس کو پڑھ کر میرے اچھے خیالات کو بہت بڑا دھکا لگا ہے۔ جسٹس صاحب کی ان چند سطور میں مغالطہ انگیزی کا رجحان ہی نہیں، حقائق کو صریحاً غلط طور پر سے بیان کیا گیا ہے اور پھر کسی قدر رنگ پروپیگنڈے کا بھی ہے، جیسا کہ عام قسم کے سیاسی لوگوں کے اندازِ تکلم میں ہوتا ہے۔ بلکہ ان الفاظ کو پڑھ کر تو ذہن پر یہ بدگمانی حملہ آور ہوتی ہے کہ اسلام اور قانونِ شریعت کے خلاف جو تخریبی محاذ ایک خاص قسم کے دانشوروں اور بیوروکریسی کے بالائی حلقوں میں کام کر رہا ہے کہیں جسٹس صاحب دانستہ یا نادانستہ طور پر اس کے زیر اثر تو نہیں ہیں۔ یہاں سیکولرازم اپنے دانتوں اور ناخنوں کا سارا زور لگا کر یہ کوشش کر رہا ہے کہ اوّل تو کوئی اہم اور مؤثر اقدام اسلام کے رُخ پر ہونے نہ پائے، قدم اُٹھے تو رُک رُک کر اُٹھے اور ادھورا رہے، اور اس قسم کے ادھورے قدم کو بھی دباؤ ڈال کر ناکام کر دیا جائے۔ متذکرہ پیراگراف سیکولرسٹ ذہنیت کا آئینہ دار ہے۔

اِس قسم کی رائے قائم کرنے سے ہم آخری حد تک گریز کرتے مگر بعض باتیں ایسی ہیں جو ہمیں کسی اور رُخ پر سوچنے ہی نہیں دیتیں۔ مثلاً یہ بات کہ (مروجہ) قانونِ شہادت اور ضابطہ فوجداری میں کوئی ترمیم یا تبدیلی (اور اس سے مراد ہے شریعت کا نفاذ) کرنے سے عوام کی مشکلات میں مزید اضافہ ہوگا۔ اور کسی کو انصاف نہیں ملے گا۔ اس آخری فقرے کے معنی یہ ہوتے کہ اسلامی قوانین اور شرعی حدود انسانیت کو انصاف بہم پہنچانے میں ناکام ہیں۔ انصاف کا تو بس ایک ہی نظام ہے اور وہ وہی ہے جو انگریزی حکومت نے ہم پر ٹھونس دیا ہے، نہ اس سے پہلے کبھی کوئی انصاف ہوتا تھا اور نہ اس کے بعد ممکن ہے۔ سابق تاریخ ہی نہیں، موجودہ دنیا میں جہاں کہیں مروجہ قانونِ شہادت اور ضابطۂ فوجداری نافذ نہیں ہے وہاں کے عوام بڑی مشکلات میں مبتلا ہیں اور محروم انصاف ہیں۔

جج صاحب زیادہ سے زیادہ جو رعایت اسلام کو دے سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ جو کچھ ہو وہ اسلامی آئین کے تحت نہیں بلکہ اسلامی آئین کے حوالے سے ہوتا رہے۔ مگر لکیر کا فقیر نہ بنا جائے۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایک جج یہ الفاظ کہہ رہا ہے، جب کہ جج حضرات ساری عمر کرسی پر بیٹھ کر لکیر کی فقیری کرتے رہتے ہیں۔ نظامِ قانون کوئی بھی ہو اس میں شاعری اور ادب کی طرح تخلیق سے کام نہیں چلتا بلکہ لازماً نظیر کی

فقیری" کرنی پڑتی ہے۔ قانون کے ایک ایک لفظ کے اتباع میں مکھی پر مکھی مارنی پڑتی ہے۔ آپ کہیں بھی مکھی پر بھینس نہیں مار سکتے۔ ورنہ قانون و انصاف کا نظام متزلزل ہو جائے گا۔ انگریزی قانون کی کھینچی ہوئی لکیروں کی فقیری کے خلاف تو کبھی آپ یا کسی اور میں جذبۂ بغاوت پیدا نہ ہوا کہ آپ ان لکیروں کو توڑ پھوڑ کر نئی لکیریں بنا سکتے اور برسوں سے قائم شدہ اصولوں کو جڑوں سے اکھیڑ کر نئے اصولِ قانون وضع کر لیتے۔ لکیر کی فقیری کا سارا احساس محض اسلام ہی کے لیے کیوں؟

اب متذکرہ اقتباس میں اٹھائے گئے مسائل کا جواب دینے سے پہلے ذرا چند تمہیدی باتیں ہو جائیں —

اسلام کا تصورِ انصاف بنیادی طور پر یہ ہے کہ اصل انصاف وہ ہے جو خدا و رسولؐ کے دیئے قانون کے ذریعے حاصل ہوتا ہو۔ ہر وہ فیصلہ اور حکم جو خدا نے دیا اور جسے اس کے رسولؐ نے پہنچایا وہ عین انصاف ہے اور اس سے ہٹ کر جو کچھ ہے وہ انصاف نہیں بلکہ ہلکے یا بھاری درجے کا ظلم ہے۔

اسلامی قانون یا نظامِ شریعت ان لوگوں کے لیے ہے جو اس اساسی اصول کو بے چون و چرا تسلیم کرتے ہوں اور اس کے سامنے رضاکارانہ جذبے سے سرِ تسلیم خم کر دیں۔ جو لوگ اسلامی تصورِ انصاف یا اس کے اصول و احکام کو پسند نہ کرتے ہوں، اسلام کا سرے سے ان سے کوئی مطالبہ ہے ہی نہیں وہ جہاں سے چاہیں اپنے لیے دین اور قانون اور انصاف ڈھونڈتے رہیں۔

اس چیز کو ہم دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اسلام پورے کا پورا "لکیر کی فقیری" کا نام ہے۔ جو لکیریں خدا اور اس کے رسولؐ نے کھینچ دی ہیں اُن کی ہر اس شخص کو فقیری کرنی ہوگی جس نے اپنے لیے دینِ اسلام کو پسند کیا۔ یہاں آکر نہ من گھڑت فلسفے چل سکتے ہیں نہ من پسند قوانین۔

اسلام کے قانونِ شہادت کے سمجھنے میں اہلِ تفقہ میں اختلاف ہو سکتے ہیں، مگر اصولاً قانونِ شہادت جو کچھ ہے اُسے جوں کا توں اختیار کرنا ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے اور کسی مسلم ریاست کا تو جواز وجود ہی اسے اختیار کرنے سے وابستہ ہے۔ ورنہ اگر اسلام کے قانونِ شہادت کے موجود ہوتے ہوئے اُسے بالائے طاق رکھ کر غیروں کے ہاں سے کوئی دوسرا قانونِ شہادت لینا ہے تو پھر کسی دوسرے اسلامی قانون یا اسلامی عقیدے یا اسلامی ادارے کے لیے کیا گارنٹی رہ جاتی ہے کہ اسے بالائے طاق نہیں رکھا جائے گا۔ کل ایک شخص اُٹھ کر کہتا ہے کہ بُت کدوں کے ذریعے مجھے توحیدِ خدا کا نور ملتا ہے یا شرک کے ذریعے سوسائٹی کے لیے آسانیاں پیدا ہو سکتی ہیں اور پھر ایسے لوگوں کو

چھوٹ دے دی جائے تو وہ پیچ کس لے کر اسلام کی مشینری کو کھول ڈالیں اور اس کے جو پرزے چاہیں نکال کے پھینک دیں اور جو نئے پرزے چاہیں لگا دیں۔ اِس طرح اسلام بہ حیثیتِ دین یا بہ حیثیت قانون یا بہ حیثیت نظام باقی رہ ہی نہیں سکتا، بلکہ کالعدم ہو جائے گا۔ اسلام کو ساتھ لے کے چلنا ہے تو سیکولر لازمی رویّہ اُس کے ساتھ نہیں برتا جا سکتا۔ اسلام سے آپ معاملہ مسلمان کی طرح کیجیے۔

یہ بات میرے فہم سے بالا ہے کہ اسلام کی رُوح کیا ہوتی ہے؟ اس رُوح کو کشید کرنے کے ماہرین نے کہاں کوئی کارخانہ لگا رکھا ہے؟ پھر اس رُوح کو ایک غیر اسلامی نظام یا آئین یا قانونِ شہادت یا ضابطۂ حدود و تعزیرات میں کس طرح اور کس تناسب سے حل کیا جاتا ہے۔ میں اس نظریاتی کیمسٹری سے بالکل بے خبر ہوں۔

دراصل اسلام سے گریز کرنے والوں نے رُوحِ اسلام کے نام سے اپنا ایک سب اسٹیشن قائم کر رکھا ہے۔ اسلام پر چلنا پسندِ خاطر نہ ہو تو کہہ دیا جاتا ہے کہ ہم رُوحِ اسلام کو اختیار کرتے ہیں۔ گویا اسلام میں ایک خاص جوہر تو رُوح ہوا اور باقی جو کچھ ہے وہ پھوگ ہی پھوگ ہے۔ میرے علم میں نہیں کہ اسلام کا کوئی معقول مدرسۂ فکر کبھی بھی ایسا ہو گزرا ہے کہ جس نے اسلام کو رُوح اور پھوگ میں تقسیم کیا ہو، ورنہ تو یہ سلسلہ تفصیلات میں بھی چلتا کہ نماز کے بجائے نماز کی رُوح، روزے کی بجائے روزے کی رُوح، جہاد کے بجائے جہاد کی رُوح کافی ہے۔ اگر لوگ دُنیوی زندگی میں ایسا کرتے ہوں کہ کھانا نہ سہی کھانے کی روح بہت ہے، یا لباس کیا کرنا لباس کی رُوح کافی ہے، یا مکان کی کیا ضرورت ہے مکان کی رُوح سے کام چل سکتا ہے، پھر تو ہم اس فلسفۂ روحانیت کے قائل ہو جاتے۔ حکومت بھی مالیے اور ٹیکس کے بجائے ٹیکس کی روح وصول کر لیا کرتی۔ ریلوں کے بجائے ریلوں کی رُوح دوڑتی پھرتی۔ یونیورسٹیوں کے بجائے یونیورسٹیوں کی رُوح اور عدالتی نظام کے بجائے عدالتوں کی روح کام دے جاتی۔ مگر مطلوب خاص طور پر اسلام کی رُوح نکال کر اُسے کام میں لاتا ہے۔ تصور کچھ ایسا ہے کہ اس کا عطر نکال کر رومالوں میں بسا لینا کافی ہے۔ یہ سب مغالطے ہیں، جن سے پہلے اپنا دل خوش کیا جاتا ہے کہ "رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی" اور پھر دوسروں کو ان سے مسحور اور شاد کام کیا جاتا ہے۔

مسلمان اور ذمی کا قتل جسٹس شوکت علی اگر محض نقطۂ نظر کے اختلاف کی باتیں کرتے تو ہم بصد مسرت ان کا ایک ایک لفظ پڑھتے یا سُنتے اور اُن سے استفادہ کر کے اپنے خیالات

بھی عرض کر دیتے۔ مگر افسوسناک امر یہ ہے کہ انہوں نے قانونِ شریعت کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کی ہیں۔ اُن کا یہ کہنا کہ "اسلامی قانون کے مطابق جب کوئی مسلمان کسی غیر مسلم کو قتل کرے گا تو اُسے سزا نہیں دی جا سکے گی"[۱] اسلام اور شریعت کے خلاف ہزارہا انسانوں میں ایسے مغالطے پیدا کرنے کا موجب ہو گا کہ جن کو رفع کرنا آسان نہیں۔ بلکہ پاکستان کی غیر مسلم اقلیت ایک جج کے اس ارشاد کی وجہ سے اسلامی ریاست اور اسلامی دستور اور اسلامی نظام اور اسلامی قانون کے قیام کے خلاف جذباتی ہیجان میں مبتلا ہو سکتی ہے۔

عبرت اس بات پر ہے کہ اگر جج صاحب کا مطالعہ کافی نہ تھا تو وہ انٹرویو میں برسرِ عام ایک کمزور بات نہ کہتے اور اگر حقیقت معلوم ہونے کے باوجود انہوں نے اس طرح کا اظہار کیا ہے تو پھر ہم کیا عرض کریں؟

میں جسٹس صاحب سے عرض کرتا ہوں کہ قرآن و حدیث کے نصوص اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدینؓ اور جلیل القدر صحابہؓ کے فیصلے اس بات کی دلیل ہیں کہ مسلمان کو ذمی کے بدلے قتل کیا جائے گا۔ اور مسلمان سے دیت دلانے کی صورت میں ذمی مقتول کی بھی اتنی ہی دیت دلائی جائے گی جتنی دیت مسلمان مقتول کی دلائی جاتی ہے۔ چند دلائل و نظائر ملاحظہ ہوں:

۱۔ امام طحاوی نے سند سے نقل کیا ہے کہ محمد بن المنکدر راوی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ذمی کا مسلمان سے قصاص دلایا اور فرمایا "میں اپنے ذمہ کو پورا کرنے کا زیادہ حق رکھتا ہوں"۔

۲۔ ابوبکر جصاص نے احکام القرآن جلد ۱ ص ۱۷۵ میں سندوں سے یہ بات نقل کی ہے کہ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ نے ذمی کے بدلے مسلمان کو قتل کرنے کا فیصلہ فرمایا۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعود

---

[۱] میں نہیں سمجھ سکا کہ غیر مسلم کے قتل پر مسلمان کو کوئی سزا نہیں ہو گی کا ادعا انہوں نے کس بنا پر کیا ہے۔ بحث کا نقطہ یہ تو ہو سکتا تھا کہ ذمی کے قتل پر مسلمان سے قصاص لیا جائے گا یا دیت دلوائی جائے گی۔ اس پہلو سے بھی دلائل کا پلڑا اسی بات کے حق میں بھاری ہے کہ ذمی کا قصاص مسلمان سے لیا جائے گا۔ حنفی فقہ کا مسئلہ یہی ہے اور ظاہر ہے کہ پاکستانی مسلمانوں کی بھاری اکثریت فقہ حنفی سے تعلق رکھتی ہے۔ ایسے حالات میں خواہ مخواہ ایک مغالطہ اٹھانے کی کوشش اسلام یا پاکستان کی خیر خواہی نہیں۔

کا بھی یہی فیصلہ ہے اور تین جلیل القدر صحابہؓ سے یہ مروی ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز خلیفۂ راشد نے اس معاملہ میں ان کا اتباع کیا ہے۔

نیز ابوبکر جصاص نے ذمی کی دیت کے بارے میں درج ذیل واقعات سندوں سے نقل کیے ہیں:

ا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ذمی کی دیت مسلمان کے برابر دلائی۔ (ابن عمرؓ)

ب۔ حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ ذمی کی دیت مسلمان کے برابر دلواتے تھے (ابوالہیثم)

ج۔ رفاعہ بن مسئول یہودی شام میں قتل کر دیا گیا تھا تو حضرت عمرؓ نے اس کی دیت ایک ہزار دینار دلوائی (حضرت جعفر بن عبداللہ بن الحکم)۔

د۔ ابن مسعود فرماتے ہیں کہ اہل کتاب کی دیت مسلمانوں کی دیت کے برابر ہے (علقمہ، ابراہیم، مجاہد، عطا اور شعبی کا یہی مسلک ہے)۔

س۔ ایک مسلمان نے ذمی کو قتل کر دیا تھا تو حضرت عثمانؓ نے ایک مسلمان کے برابر اس کی دیت دلوائی (زہری عن سالم عن ابیہ)

جج صاحب کو شاید کافر حربی (AT-WAR) یا کافر مرفوع القانون (OUT-LAW) کے متعلق کوئی بات پڑھنے میں غلط فہمی ہوتی ہے۔ اگر کسی کافر قوم کے خلاف اسلامی ریاست حالتِ جنگ میں ہو تو اِدھر کا مسلمان اگر اُدھر کے کسی کافر کو مار ڈالے تو نہ غیر مسلم ریاست کی عدالت میں کوئی کارروائی ہو سکتی ہے اور نہ اسلامی ریاست اپنے مسلمان شہری کو اس بنا پر قتل کر سکتی ہے کہ اس نے حربی کافر کو ملک کے باہر یا ملک کے اندر مار ڈالا ہے۔ ویزا لے کر آنے والا غیر مسلم ایک مشترکہ معاہدے کے تحت عارضی طور پر مستامن ہے اور مدتِ مقررہ کے لیے اس کا تحفظ ریاست کی ذمہ داری بن جاتا ہے۔ مگر ایک سمگلر یا جاسوس بغیر کسی پاسپورٹ اور ویزا کے اگر سرحد پہ پایا جاتا ہے اور اسے کوئی مسلم شہری قتل کر آتا ہے تو قصاص کا معاملہ کہاں سے پیدا ہو! یا اسی طرح اگر ہانگ کانگ میں رہنے والا مسلمان کسی غیر ملکی کافر کو وہاں کسی جھگڑے میں قتل کر آیا ہے اور وہاں کی عدالت اور پولیس کی گرفت میں نہیں آیا تو کوئی وجہ نہیں کہ اسلامی ریاست اپنے ایسے شہری کو پکڑ کر اس کے گلے پر تلوار پھیر دے۔ اس طرح کی استثنائی تفصیلات سے قطع نظر جہاں تک باقاعدہ ذمی کا معاملہ ہے، یعنی وہ غیر مسلم جس کی حفاظت کا ذمہ اسلامی ریاست نے لیا ہو، اس کی جان کے بدلے مسلم قاتل کی جان بھی لی جائے گی اور اگر معاملہ دیت

کی صورت اختیار کرے تو مسلمان کے برابر دیت دلوائی جائے گی[1]

کیا اس حقیقت کے واضح ہونے کے بعد جج صاحب احساس کریں گے کہ انہوں نے اسلام اور اسلامی شریعت کے خلاف کتنی بڑی غلط فہمی پھیلائی ہے اور اس کی کبھی جواب دہی انہیں عنداللہ کرنی ہوگی۔ اب اگر قانونِ شریعت کا نظام اپنی اس جراحتِ شدیدہ کا قصاص لینے کے لیے آپ کی عدالت میں آ کھڑا ہو تو آپ کیا فیصلہ دیں گے۔

عورت کی گواہی عورت کی گواہی ایک وسیع بحث ہے۔ پہلے ہم جسٹس صاحب کے اس بیان کو لیتے ہیں کہ کسی عورت کے سامنے اگر گھر میں اس کا شوہر قتل ہو جائے تو وہ اسلامی قانون میں گواہی نہیں دے سکے گی، نتیجہ یہ کہ قاتل بچ نکلے گا۔ یہ پوری بات ہی غلط ہے۔ یا تو جج صاحب نے مطالعہ نہیں کیا یا شرعی اصطلاحات کو نہیں سمجھا۔ نیز ان کے بیان سے واضح ہے کہ دورِ نبوت کے نظائر بھی ان کے سامنے نہیں ہیں۔

اُصولی بحث سے پہلے میں دو تین واقعاتی نظائر کو بیان کرتا ہوں۔

۱۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ایک خاتون کو زبردستی نشانہ ہوس بنایا گیا تھا۔ حضورؐ نے تنہا اس خاتون کے بیان پر ایک شخص کو سزا سنا دی جو پکڑا ہوا لایا گیا تھا۔ اس پر اصلی مجرم شدید احساس کی وجہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور جرم کا اقرار کیا۔ چنانچہ اس دوسرے شخص کو سزا دی گئی اور پہلے کو چھوڑ دیا گیا[2]۔

اب دوسرے شخص کے قصہ کو الگ رکھ دیجیے۔ یہ دیکھیے کہ تنہا ایک عورت کے بیان پر خواہ آپ اسے مدعیہ سمجھیں یا گواہ، (اور مدعی یا مدعیہ بھی ایک طرح سے ذریعہ شہادت ہی ہے)۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عدالتی کارروائی مکمل کر دی (الطرق الحکمیہ۔ ابن قیم)۔

۲۔ حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ ایک یہودی نے کسی لڑکی کا سر دو پتھروں کے درمیان کچلا۔

---

[1] اور ایسے واقعات خود مسلمانوں کے خلاف بھی بکثرت ہو رہے ہیں ایسے کسی قتل کی کوئی قانونی چارہ جوئی نہیں ہوتی یا نہیں ہو سکتی۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ دنیا میں قتل کی کوئی قانونی سزا بھی نہیں۔

[2] حضورؐ نے اس پہلے شخص سے پوچھا کہ تم نے کیوں خاموشی سے سزا کو قبول کر لیا۔ اس نے جواباً عرض کیا کہ میں نے یہ محسوس کیا کہ اب میرا انکار جرم بیکار ہے۔

دوسری روایت میں یہ ہے کہ ایک لونڈی زیور پہنے نکلی تو ایک یہودی نے اُسے پتھر کھینچ مارا۔ اس مضروبہ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لایا گیا، ابھی اُس میں جان باقی تھی۔ حضورؐ نے اُس سے پوچھا کہ فلاں نے تجھے مارا ہے؟ اُس نے سر کے اشارے سے نفی میں جواب دیا۔ پھر کسی اور کا نام لے کر پوچھا مگر لڑکی نے سر ہلا کر انکار کر دیا۔ تیسری بار اُس یہودی کا نام لے کر حضورؐ نے پوچھا جس نے اُسے مارا تھا تو اس پر لڑکی نے سر کی جنبش سے اثبات میں جواب دیا۔

مضروبہ کے عورت ہونے اور نصف گواہی کا حق رکھنے کے باوجود صرف خود اس کے اپنے بیان پر (جو سوالوں کے جواب میں سر کی جنبش سے دیا گیا) حضورؐ نے ملزم کو طلب کیا، وہ پیش کیا گیا، اس سے پوچھ گچھ کی گئی، یہاں تک کہ اُس نے اقرار کر لیا۔ حضورؐ نے قانونِ قصاص کے تحت اُس کا سر دو پتھروں کے درمیان کچلوا دیا۔[1] (مشکوٰۃ، کتاب القصاص الفصل اوّل نیز اُردو میں ملاحظہ ہو۔ دربارِ رسولؐ کے فیصلے۔ ناشر: آئینہ ادب طبع ۱۹۶۶ء ص ۳۴، ۳۵)۔

۳۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رضاعت کے معاملے میں صرف ایک عورت (وہ بھی لونڈی) کے بیان یا شہادت کی بنا پر عقبہ بن حارث اور ان کی بیوی ام یحییٰ بنت ابی دہاب کا نکاح ختم کرا دیا تھا۔ اُس عورت نے شہادت دی تھی کہ مَیں نے عقبہ اور ام یحییٰ دونوں کو دودھ پلایا تھا۔ صورتِ حالات کا یہ پہلو عجیب تھا کہ نہ عقبہ کو معلوم، نہ ام یحییٰ کو اور نہ اُن دونوں کے خاندانوں میں اس کے لیے کوئی گواہ، لیکن حضورؐ نے فرمایا کہ جب یہ کہہ رہی ہے کہ میں نے دودھ پلایا ہے تو مَیں کیا کر سکتا ہوں۔ (صحیح بخاری۔ کتاب الشہادت۔ نیز اعلام الموقعین، جلد ۱ ص ۱۵۔ نیز عمدۃ الفقہ ص ۳۱)۔

ذرا سا غور کریں تو اندازہ ہو جائے گا کہ تفریقِ نکاح کا معاملہ حدود سے بھی بھاری تھا اور اس کے سماجی اثرات و نتائج کا حلقہ بڑا وسیع تھا۔

---

[1] فقہا کی بحثوں میں یہ پہلو بھی آتا ہے کہ سزا تو مجرم کے اقرار کی وجہ سے نافذ ہوئی، مگر ہمارا کہنا یہ ہے کہ تنہا ایک عورت کے بیان کی اتنی اہمیت تھی کہ اس کی بنا پر ملزم کو طلب کیا گیا اور جرح و تفتیش کی گئی۔ اب یہ تو نقشۂ احوال اور قرائن اور حضورؐ کے سامنے حاضری کا اثر تھا کہ وہ اقرار پر مجبور ہوا۔ اصل مسئلہ تو یہ ہے کہ عورت کے بیان پر پوری کارروائی ہوئی۔

میں ان تین قطعی دلائل و نظائر کو جج صاحب کی خدمت میں پیش کر کے معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آخر انہوں نے یہ الفاظ کیسے ارشاد فرمائے کہ گھر میں شوہر کے قتل ہو جانے پر اسلامی قوانین کے تحت عورت گواہی نہیں دے سکے گی اور ملزم بچ نکلے گا۔

عورت کی گواہی کے چند مزید پہلو ایسے تمام امور جن میں عموماً مرد مطلع نہیں ہوتے اور عموماً عورتیں ہی مطلع ہوتی ہیں۔ اُن میں صرف ایک عورت کی شہادت بھی کافی ہو سکتی ہے۔ مثلاً عورتوں کے اُمورِ باطنہ، عورتوں کے کنوارپن، حائضہ یا حاملہ ہونا، ولادت، رضاعت، وصیت، رجعت وغیرہ مسائل۔

یہ معاملہ یہاں تک جاتا ہے کہ اگر کسی لڑکی کے زانیہ ہونے پر چار گواہ بھی پیش ہو جائیں لیکن کسی ماہرِ فن یا ذی فہم عورت کی طرف سے یہ گواہی ملے کہ لڑکی کی عمر یا اس کے عضوی ساخت ابھی تک اس جرم کے قابل نہیں ہیں یا ایسا جرم ہونے کے کوئی آثار نہیں ہیں تو تنہا ایک عورت کی گواہی (جسے آدھی گواہی کہا جاتا ہے) کی بنیاد پر زنا کے چاروں گواہوں کی گواہی غیر مؤثر ہو جائے گی۔ آج بھی ایک لیڈی ڈاکٹر یا ایک کوالیفائڈ نرس یا دایہ کی اس معاملے میں رپورٹ اور گواہی مؤثر ہوتی ہے۔ یا مثلاً زمانۂ قدیم کے زنانہ حماموں یا اُن پر قیاس کر کے آج کل کے خالص زنانہ ہسپتالوں یا اسکول یا ریل کے زنانہ ڈبوں کا معاملہ لیجیے، ایسے مقامات پر اگر کسی عورت کے ہاتھوں عورت قتل ہو جائے یا وہ شدید طور پر زخمی ہو جائے تو تنہا ایک عورت کی گواہی بھی قصاص کے لیے کافی ہو سکتی ہے۔

(اعلام الموقعین، جلد ۱ ص ۲۴)

اسی طرح کوئی بھی ایسے حالات جہاں مرد کی شہادت بالعموم قابلِ حصول نہ ہو، یا کسی خاص صورتِ حالات میں مرد کی شہادت ناپیدا ہو تو قانونِ ضرورت کے تحت عورت ہی کی شہادت پر قانونی فیصلے کا انحصار ہوگا۔ چنانچہ گھریلو زندگی میں جہاں بکثرت صورتوں میں ایک مرد اور ایک عورت (یا کبھی ساتھ چند بچے) موجود ہوتے ہیں، وہاں اگر صاحب خانہ کے قتل کا واقعہ ہو جائے تو اُس کی بیوی ہی کی شہادت کو اوّلیت حاصل ہو گی۔ اسی طرح کسی بیٹی اور باپ اور کسی بہن اور بھائی کے معاملے کو قیاس کیا جا سکتا ہے۔

اس سے بھی آگے معاملہ یہاں تک جاتا ہے کہ حالتِ سفر سے متعلق کسی معاملے میں اگر کوئی اور گواہی

نہ ہو تو غیر مسلم کی گواہی سُنی جائے گی۔

قرائنی شہادت کی اہمیت | قرائنی شہادت کی اہمیت ہر مقدمے میں سب سے ضرورت ہوتی ہے۔ نیز نصابِ شہادت کی کمی کو قرائنی شہادت پورا کر دیتی ہے۔ بلکہ قرینہ خود شہادت کا قائم مقام ہوتا ہے۔ جس طرح قسم شہادت کی قائم مقام ہو سکتی ہے۔

حافظ ابن قیم کہتے ہیں کہ اگر کسی معاملے میں ایک ہی گواہ ہو (یا صرف عورت کی گواہی ہو) لیکن قرائن اُسے ثابت کرتے ہوں تو اتنی ہی شخصی گواہی پر حکم لگایا جائے گا۔ بلکہ حافظ صاحب کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ سلسلۂ قرائن کا ہر جزو گواہ کا قائم مقام ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

۱۔ کسی شخص کی کوئی چیز کھوئی گئی ہو اور وہ اس کے اوصاف اور نشانات بتاتا ہو، پھر وہ چیز کہیں سے مِل جائے تو اُسے وہ لے سکتا ہے، یا کسی شخص کے قبضے میں ہو تو اُس کے قبضے سے نکال سکتا ہے۔ اُس کے بتائے ہوئے اوصاف کا شئے مقصود کے مِل جانے پر اُس میں پایا جانا دو گواہوں کی گواہی کے برابر ہے۔ بہ صورت اگر نہ ہو تو کوئی شخص اپنی گم شدہ چیز دو گواہ پیش کیے بغیر حاصل ہی نہ کر سکے۔

۲۔ خلفائے راشدینؓ اور صحابہ کرام نے حمل کی بنا پر حدِ زنا جاری کی، کیونکہ کم سے کم بے شوہر عورت کی حد تک تو یہی علامت یا قرینہ اس کے زانیہ ہونے کی قطعی شہادت ہے۔

۳۔ اسی طرح کسی شخص کے منہ سے شراب کی بُو آنے یا شراب آمیز بدبُو دار قے ہونے پر بھی حدِ خمر جاری کی گئی۔

۴۔ اسی طرح اگر کسی مشتبہ چور یا شناخت شدہ ملزم سرقہ کے قبضے سے چوری کا مال انہی تفاصیل اور معلومات و علامات کے مطابق برآمد ہو جاتا ہے جو مسروق عنہ نے پیش کی ہیں تو آخر کیا وجہ ہے کہ اُسے چور نہ قرار دیا جائے۔ فرق صرف اتنا واقع ہو سکتا ہے کہ اُس پر قطعِ ید کی حد جاری نہ ہوگی، لیکن اُس سے مال واپس دلوانے کے علاوہ جرمانے، قید اور تازیانے کی سزائیں دی جا سکتی ہیں۔

اسی طرح دوسرے جرائم کے مقدموں اور شہادتوں کے متعلق قیاس کیا جا سکتا ہے۔ شہادتِ قرائن کے سلسلے میں عہد بہ عہد جو ترقیات ہوتی ہیں اور خاص طور پر جدید سائنسی ایجادات اور نفسیاتی تجزیہ کاری، کیمیاوی دریافتوں اور تفتیشی طور طریقوں نے قرائن کے دائرے کو وسیع اور ان کے

اجزا کو مضبوط و مؤثر کر دیا ہے۔ اس کا لحاظ شریعتِ اسلامیہ کے قانونِ شہادت کی تدوینِ نو میں لازماً رکھا جانا چاہیے۔

تنہا ایک عورت کی شہادت ہو یا دوسرے مردوں یا عورتوں کے ساتھ شامل ہو ہر حال میں فیصلے میں بہت بڑا دخل قرائن کا ہے۔

جناب جسٹس شوکت علی صاحب کی گفتگو میں یہ کوتاہی ہے کہ عورت کی شہادت کا مسئلہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے مجرد شخصی شہادت کو لے لیا ہے اور شہادت کے دوسرے متعلقہ پہلوؤں کو نہیں لیا ہے۔

یا مثلاً کسی وقوعہ زنا میں گواہ زنا کی آخری تکمیلی شکل کی شہادت نہیں دیتے بلکہ صرف اس قدر بات بیان کرتے ہیں کہ ہم نے مسمی فلاں اور مساۃ فلاں کو ایک لحاف میں پڑے دیکھا۔ انہوں نے ایک کمرے میں بند ہونے کا ارتکاب کیا وغیرہ تو قاضی اس پر حدِ مقررہ تو نافذ نہیں کرے گا لیکن وہ تعزیری سزا ہر درجے کی دے سکتا ہے۔ ابن تیمیہ تو یہ مثال دے کر اس کے لیے ایک گواہ کو بھی کافی قرار دیتے ہیں (فتاویٰ ابن تیمیہ جلد ۱۵ - ص ۳۰۶)۔

یا مثلاً قاضی کے سامنے قرائن یہ ہیں کہ ایک شخص چھری لیے ہوئے ایسے مکان سے نکلا جس میں ایک آدمی کو مذبوح پایا گیا تو شخص مذکورہ کو ملزم قرار دیا جائے گا۔ اگر بقدرِ ضرورت شہادت مل جائے یا قرائن ثبوتِ جرم میں مدد دیں تو قاضی اُسے قاتل قرار دے سکتا ہے اور چاہے تو قتل کی سزا بھی تعزیراً نافذ کر سکتا ہے۔ (معین القضاۃ والمفتیین ص ۵۷)۔

تعزیری سزا حد کی مقدار سے زیادہ بھی دی جا سکتی ہے جیسا کہ ہم اُوپر لکھ چکے ہیں کہ امام (یا اس کے قاضی) کو اختیار ہے کہ وہ عادی چور کو (یا چوری کے عمل کے ساتھ مزید شناعت کی وجہ سے) قتل کی سزا دے۔

لہ مثلاً قاتل ومقتول کے درمیان کسی فساد یا جھگڑے کا ہونا: قاتل کی طرف سے کسی موقع پر مقتول کو دھمکی دینا، خون کے دھبے اُس کی انگلیوں اور پاؤں کے نشانات۔ قتل میں چھری کے استعمال کی علامت، مقتول کے پاس قاتل کی کسی چیز کا گرا پڑا رہ جانا یا خود قاتل کے پاس سے مقتول کی کسی شے یا مال کا برآمد ہونا وغیرہ۔

اور تعزیری سزا کو بھی امام اُس وقت تک معاف نہیں کر سکتا جب تک وہ شخص معاف نہ کرے جس کے ساتھ زیادتی کی گئی ہو (رد المختار جلد ۳ ص ۲۰۵)۔

حد جس درجے کے شبہات سے ختم ہو جاتی ہے، تعزیر ویسے شبہ کے رہ جانے کے باوجود دی جا سکتی ہے (الرد المختار جلد ۳ ص ۱۹۴)۔

ظاہریہ کا مسلک عورت کی گواہی کے متعلق ظاہریہ کا مسلک شہادت النساء کے بارے میں خاصا مختلف ہے۔ مگر میں اس کے بیان سے پہلے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگرچہ ہمارے نہایت ہی محترم بزرگانِ سلف اس کے علمبردار ہیں مگر جمہور علما چونکہ اس کے برعکس کو کتاب و سنت کے نصوص سے اقرب قرار دیتے ہیں۔ اس لیے پوری اُمت نے بہ حیثیت مجموعی جمہور کے مسلک کو اختیار کیا ہے[1]۔ بصورتِ دیگر اگر ظاہریہ کے طریق استنباط کو اختیار کیا جائے تو قیاس پر مبنی تمام فقہی نظام متزلزل ہو جاتے ہیں اور بے شمار دوسرے مسائل عامہ میں الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ خود پاکستان میں بھی مسلمانوں کی بھاری اکثریت ظاہریہ کے مدرسہ فکر سے متعلق نہیں، بلکہ حنفی نظامِ فقہ سے وابستگی رکھتی ہے۔ اس وجہ سے اگر اس قوم پر اس کے قبول کردہ اور رائج و معروف فقہی نقطۂ نظر کے خلاف اوپر سے کوئی دوسرا مسلک ٹھونس دیا جائے تو اس کا نتیجہ خرابیٔ احوال کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔

یہاں ہم علمی حیثیت سے بطورِ فرض اس مسلک کو بیان کیے دیتے ہیں۔

ا۔ علامہ حافظ ابن قیم فرماتے ہیں کہ قرآن کے جس مقام سے نصاب شہادت اخذ کیا جاتا ہے اس کا تعلق عدالتی کارروائیوں اور فیصلوں سے ہے ہی نہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ نہیں ہوگا کہ اگر مروج نصوص کے مطابق نصابِ شہادت (ایک مرد + دو عورتیں) پورا نہ ہو تو عدالت حدود و قصاص نافذ نہیں کرے گی۔ قرآن کے جس مقام سے بحث ہے اس کا تعلق اہلِ حقوق سے ہے کہ وہ اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے اس خاص نصابِ شہادت کو قائم کرنے کا اہتمام کریں، تاکہ اس عمل کا احتمال نہ رہے کہ وہ عدالت میں اپنے حق کی وصولی میں کوئی مشکل حائل پائیں۔ یعنی یہ نصاب شہادت خاص خاص

---

[1] یعنی ایک تو فقہ کے تمام مدارس اہل الظاہر کے اُصولِ تفسیر، اُصولِ استنباط اور اُصولِ احکام کو قبول نہیں کرتے، دوسرے قانونِ شہادت میں ان کے نقطۂ نظر کو دائرہ تعزیری تو اختیار کرتے ہیں، حدود و قصاص میں نہیں کرتے۔

حالات میں قرض اور وصیت وغیرہ کی دستاویزوں کے لیے تجویز کیا گیا ہے (اعلام الموقعین۔ الطریق الحکمیہ)۔

۲۔ اب امام ابن تیمیہؒ کا مدعا بھی ہمارے الفاظ میں سنیے۔ قرآن کی ایک آیت سے استدلال کرتے ہیں۔ وہ یہ ہے:۔ اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا ...الخ امام کی رائے میں یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ حدود و تعزیرات کے معاملے میں ایک عادل آدمی کی گواہی بھی کافی ہے۔ کیونکہ یہ آیت اُس صورتِ واقعہ پر نازل ہوئی کہ ایک شخص نے ایک قوم (یا قبیلے) کے بارے میں یہ اطلاع دی کہ وہ لوگ مرتد ہو کر یا نقضِ عہد کر کے اسلام کے خلاف برسرِ پیکار ہو چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی اطلاع ملنے پر ایک قوم کے خلاف جنگی کارروائی ہو سکتی ہے (جو ایک فرد کے خلاف کارروائی ہونے سے بہرحال بہت بڑی بات ہے)۔ اس پر قرآن کا مطالبہ یہ ہے کہ خبر لانے والے کی جانچ کرو، تفتیش کرو، وہ کون آدمی ہے؟ اخلاق و کردار کے لحاظ سے کیسا ہے؟ مسلمانوں میں اس کو کیا مقام حاصل ہے وغیرہ۔ اگر اُس کی شخصیت، اُس کے بیان کا تجزیہ اور سامنے کے قرائن اس کی بات کو قابلِ قبول ثابت کر دیں تب تم کارروائی کر سکتے ہو۔ بصورتِ دیگر ایک مجہول آدمی سے ایک افواہی بات سُن کر اگر تم جذباتی ہیجان میں آ کر ایک قوم پر چڑھ دوڑو تو بڑی زیادتی ہوگی۔ (فتاویٰ ابن تیمیہ جلد ۱۵ ص ۳۰۷)۔

اس آیت کے متعلق علامہ ابن تیمیہؒ کا مسلک یہ ہے کہ کسی قوم کے خلاف کارروائی کرنے سے کسی فرد کے خلاف کارروائی کرنا بہت چھوٹا معاملہ ہے اور جب پہلی صورت میں صرف ایک ایسی شہادت یا خبر کافی ہو سکتی ہے جس کی چھان بین کر لی گئی ہو تو آخر دوسری صورت میں کیوں ایک ہی شہادت کافی نہیں ہے۔

دوسرے لفظوں میں امام ابن تیمیہؒ نے جمہور کے اختیار کردہ نصابِ شہادت کو سرے سے ترک کر کے بالکل مختلف مقام سے بڑا زوردار استدلال کیا ہے۔

یعنی دونوں بزرگوں نے نصابِ شہادت کو بدل کر ایسی صورت پیدا کر دی ہے کہ عدالت میں عورت کی گواہی کو وہی حیثیت حاصل ہو سکتی ہے جو مرد کی گواہی کو، اور جس طرح بعض صورتوں میں صرف ایک مردِ عادل کی شہادت پر حدود و تعزیر کا نفاذ ہو سکتا ہے اسی طرح کسی

خاتون عادلہ کی شہادت پر بھی ہو سکتا ہے۔

مگر آخر میں میں پھر یہ کہتا ہوں کہ علمی طور پر یہ اہم اور بصیرت افروز بحث ہمارے قانونی سرمایہ افکار میں موجود ہے مگر ائمہ فقہا اور جمہور علماء نے ظاہریہ کے نقطہ نظر کو تعزیرات کے دائرے میں تو قبول کیا ہے (اور اس حد تک بہت بڑا اتفاق رائے ہے) مگر حدود و قیاس کے معاملے میں قبول نہیں کیا ہے۔

اصل الجھن جدیدیت زدگان کی اصل مشکل کا آغاز تو اس اصول سے ہوتا ہے کہ عورت کی شہادت نصف کیوں ہے، مگر اس سے بھی زیادہ پیچیدگی اُن کو ہمارے سابق قانونی لٹریچر کے اصطلاحی اندازِ بیان کی وجہ سے پیش آتی ہے۔ وہاں ان کو کسی مقام پر ایسی عبارت بھی ملتی ہے کہ محض عورت کی شہادت پر قصاص یا حدود کا نفاذ نہیں ہو سکتا[1] مگر سوال یہ ہے کہ محض ایک مرد اگر شہادت دے تو بھی یہی صورت ہے۔ اس کے کہنے پر حد جاری نہیں ہو گی۔ بلکہ اگر پورے دو مرد گواہ بھی زبانی گواہی دے دیں (اور بہت سے لوگ دشمنی کی سازش کر کے گواہی دے سکتے ہیں) تو بھی قصاص کا اجرا اُس وقت تک نہیں ہو گا۔ جب تک قرائن سے وقوعہ کی کہانی ثابت نہ ہو۔ مثلاً فرض کیجیے کہ جس شخص پر الزام ہے اُس کے پاس ناقابل تردید ثبوت ہے اس بات کا کہ اس دن وہ جاپان یا کینیڈا کے درمیان سفر کر رہا تھا یا وہ کوئٹہ کے کسی ہسپتال کے آپریشن تھیٹر میں تھا یا اور کسی طرح کے تردیدی ثبوت ہو سکتے ہیں، جن میں قسم بھی شامل ہے تو ایسی صورت میں دو گواہوں کی گواہی کے الفاظ تو فوری طور پر حدود و تعزیرات نافذ نہیں کرا دیں گے۔

---

[1] بلکہ قانونی عبارتیں تو ایسی ہیں کہ لا تقبل شہادۃ النساء فی القصاص والحدود۔ بعید نہیں کہ اس کے معنی یہ سمجھے گئے ہوں کہ حدود کے کسی مقدمے میں جونہی کوئی عورت عدالت کے سامنے پر نمودار ہوئی، جج صاحب پکاریں: مائی چلی جاؤ، یہاں حدود کا مقدمہ ہو رہا ہے۔ یہاں کوئی عورت گواہی نہیں دے سکتی۔ حالانکہ یہاں لا تقبل کے معنی صرف اتنے ہیں کہ قصاص و حدود کے معاملے میں (اگر دوسرے شواہد و قرائن قوی نہ ہوں) کسی عورت کی گواہی معتبر یا مؤثر نہیں ہو سکتی۔ لیکن عین ممکن ہے کہ عورت کی گواہی عدالت کے سامنے بعض عینی یا قرائنی شاہدوں کی نشاندہی کر دے۔

اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ شہادت اگر نصابِ مقررہ سے کم ہو، مگر قرائن ایسے ہوں کہ قطعیت سے کسی جرم کو ثابت کرتے ہوں تو شہادتِ قرائن شہادتِ اشخاص کی کمی کو پورا کر سکتی ہے۔

اسلامی شریعت سے پریشان ہونے والوں کی دوسری اُلجھن یہ ہے کہ وہ قصاص و حدود اور تعزیرات میں فرق نہیں کرتے۔ اسلام میں سزا کی دو قسمیں ہیں:-

۱۔ بصورتِ قصاص و حدود۔ اِس دائرے میں خدا کی طرف سے جو سزا مقرر کی گئی ہے اُسے کم و بیش نہیں کیا جا سکتا۔ نیز ان میں ثبوتِ جرم مکمل ہونا چاہیے۔ اگر شبہ باقی رہے گا تو قصاص و حدود کا اجرا نہیں ہو سکے گا۔ ایک عورت کی نصف گواہی میں نصابِ شہادت پورا نہ ہونے کی وجہ سے چونکہ ثباتِ جرم میں شبہات رہ جاتے ہیں اس لیے ملزم قصاص و حدود سے بری ہو سکتا ہے۔[1]

۲۔ مگر قصاص و حدود سے بری ہونے کے معنی یہ نہیں کہ کوئی مجرم سرے سے سزا سے بری ہو سکے۔ تعزیرات ایسی سزائیں ہیں جو حدود سے زیادہ بھی ہو سکتی ہیں اور کم بھی۔ ان کو حکومتِ وقت یا اس کا نظامِ عدالت یا کسی خاص مقدمہ میں اپنے اختیارات کے تحت کوئی قاضی مقرر کر سکتا ہے۔ مثلاً چوری کے کسی مقدمہ میں قطعِ ید کی شرائط پوری نہیں ہوتیں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ مجرم چھوٹ گیا۔ قاضی اُسے تعزیر میں جکڑ لے گا۔ حتیٰ کہ عورتوں کی شہادت پر بھی اس سے مسروقہ مال برآمد کرا کے مسروق عنہ کو دے سکتا ہے۔ اُس کی قیمت لے سکتا ہے، اُس پر جرمانہ کر سکتا ہے، اُسے تازیانے لگوا سکتا ہے، کئی سال کے لیے جیل میں ڈال سکتا ہے۔ امام یا قاضی کے لیے تو یہ اختیار بھی ہے کہ وہ عادی چور کو قتل کا حکم سُنا دے۔

جج صاحب کا اپنی بیان کردہ مثال میں یہ فرمانا کہ "سزا نہیں ہو سکتی" میری نگاہ میں یہ معنی دیتا ہے کہ اگر کسی مجرم پر حد نافذ نہ ہو سکے تو وہ سزا سے بچ نکلا۔ یہ قطعاً غلط ہے۔ تعزیر بھی سزا ہے اور وہ حد سے سخت تر بھی ہو سکتی ہے۔

کلمۂ اختتام آخر میں ہماری گذارش تمام اربابِ فکر و ذہانت سے یہ ہے کہ وہ اس ملک کے

[1] آخر آج بھی تو چھ چھ مردوں کی گواہی کے باوجود کسی نہ کسی پہلو سے قتل کے مجرم کو شک کا فائدہ ملتا ہے اور وہ سزائے موت سے بچ کر عمر قید پاتا ہے اور کبھی اس سے بھی کم مدت کی قید۔

باشندوں کو اسلام اور قانونِ شریعت کے متعلق شکوک و شبہات میں اُلجھانے کی تدبیروں کے بجائے اُن کو مثبت روشنی بہم پہنچائیں۔ ایسا نہ کرسکیں تو خاموش رہیں۔ اگر انہیں اسلام کی دکان کا سودا ہی پسند نہ آئے تو جس دوسرے سٹور پر چاہیں تشریف لے جائیں۔ تعلق اِدھر رکھنا ہو تو انہیں اسلام کے منہ میں اپنی باتیں ڈالنے کے بجائے اسلام ہی سے اس کی اپنی شہادت سننی چاہیے۔ اسلام کے اصول و قوانین کی مغالطہ انگیز تعبیریں نہیں بیان کرنی چاہئیں۔ اسلام کے اصول و قوانین کی برتری و بہتری کو مسلمانوں پر بھی اور دُنیا پر بھی واضح کرنا چاہیے۔ ہمارے نظامِ عدالت میں اگر عورت کی گواہی آدھی ہے، یا کسی معاملے میں گواہی اِس حد تک نہیں پہنچتی کہ حد جاری کی جاسکے، یا کسی مقدمے میں کوئی مجرم عدمِ ثبوت یا شبہ کی بنا پر چھوٹ جائے تو ان باتوں کو قبول کرنا ہوگا۔ ایک مسلمان کے لیے کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ ہاں اگر "لکیر کی یہ فقیری" چھوڑ دی جائے کہ مسلمان ضرور کہلانا ہے تو پھر "کشادہ ہیں راہیں"۔

آج اِس دُنیا میں اگرچہ مکمل اور معیاری اسلامی نظام کہیں موجود نہیں ہے مگر کم سے کم ایک مملکت میں اسلامی حدود و تعزیرات نافذ کرنے کا یہ اثر ہمیں بچشمِ سر دکھائی دیتا ہے کہ وہاں چوری، قتل اور زنا جیسے جرائم کا گراف تمام مہذب دُنیا سے بہت ہی نیچے ہے۔

جسٹس شوکت علی صاحب سے بصد ادب التماس ہے کہ وہ اسلام کے متعلق آئندہ محتاط انداز میں گوہر افشانی کریں۔

یہ بحث مولانا عبدالمالک، پروفیسر عثمان غنی۔ جناب عبدالوکیل علوی اور حافظ عبدالحمید صاحب کے مشورہ و تعاون سے مدوّن ہوئی۔ (ن۔ ص)